''کاروان وجود'': تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر حمیرا اشفاق*

Abstract:

Nisar Aziz Butt is a renowened Urdu novelist. She created her own style to reflect contemporary history through her writings.Karwan e Wajood is one of the most popular novel. This novel highlights many dimensions of inner and outer world of persons. She started this novel with question of existence and atlast she owned her society with all realities. This novel is unique in theme and technique also it can be easily placed in world classics novels.

''کاروانِ وجود'' کی مصنفہ نثار عزیز بٹ ایک نابغہ رُوزگار شخصیت ہیں۔ان کی تخلیقی زندگی کا سفر ذات سے کائنات کی طرف جاری و ساری ہے۔ان کے اب تک چار ناول ''نے چراغ نے گلے'' ''نگری نگری پھرا مسافر''، ''کاروانِ وجود''، اور ''دریا کے سنگ'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ان کے ناول اپنی زمانی ترتیب کے اعتبار سے ایک دوسرے کا تسلسل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ان کا معاصر تاریخ کو بطور پس منظر استعمال کرنا انہیں اردو ناول نگاری میں ممیّز اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔وہ ماضی کے مزاروں سے لپٹ کر گذشتہ دنوں کی یاد میں سوگوار فضا پیش کرنے کی بجائے حالات کا غیر جانبداری سے تجزیہ کرتے ہوئے نتائج اخذ کرتی ہیں۔نثار عزیز بٹ کے پہلے ناول ''نے چراغ نے گلے'' کے بارے میں شہزاد منظر لکھتے ہیں کہ:

> ''نے چراغ نے گلے'' بھی ان چند اردو ناولوں میں سے ہے۔جس میں عصر حاضر کی تاریخ کو بطور پس منظر استعمال کیا گیا ہے۔نثار عزیز بٹ نے یہ ناول بہت بڑے

* شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

کینوس میں لکھا ہے جس کا موازنہ پاکستان کے بہت کم ناولوں سے کیا جا سکتا ہے۔ناول میں بے شمار چھوٹے بڑے کردار ہیں اور کہانی کا جائے وقوع صوبہ سرحد خصوصاً پشاور ہے۔مصنفہ کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے اس لیے ناول میں اس علاقے کی تہذیب، تاریخ اور سیاست کا بڑی حقیقت پسندی سے ذکر کیا گیا ہے۔یہ ناول وسیع پس منظر میں لکھی جانے والی تین پشتوں کی کہانی ہے''(۱)

میرزا ادیب ''کاروان وجود'' کو ''نگری نگری پھرا مسافر'' پر ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نگری نگری پھرا مسافر'' کے برعکس ''کاروان وجود'' کی روئیداد جذباتی کی بجائے استدلالی ہے''(۲)

''کاروان وجود'' ایک ایسا ناول ہے جس کا سفر خارج سے باطن اور کبھی باطن سے خارج کی طرف گامزن رہتا ہے۔یہاں تک کہ مصنفہ ذات کے ان نہاں خانوں تک پہنچ جاتی ہیں جن سے وہ بظاہر پردہ اٹھانے سے گریزاں نظر آتی ہیں۔تصورِ خدا، انسان اور تقدیر، جزا اور سزا، فنا اور بقاء کی جدوجہد اور ان سب داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ رشتوں کی باہمی کشمکش مل کر ناول کی کہانی کا تار و پود بنتے ہیں۔ناول کے مرکزی کردار ''سارہ'' اور ''ثمر'' ان دونوں دنیاؤں کی نمائندہ ہیں۔نسائی کردار کہانی میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں جبکہ مرد کردار مہمیز کا کام سرانجام دیتے ہوئے کہانی کو محض آگے بڑھاتے ہیں۔دونوں نسائی کردار اس قدر بھرپور ہیں کہ بسا اوقات یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس ناول کی مرکزی ہیروئین کون ہے۔سارہ اور ثمر کے کردار ایک دوسرے کے متضاد بھی ہیں اور مماثل بھی، دونوں ایک دوسرے کے کرداروں میں سرایت بھی کرنا چاہتے ہیں اور اجتناب بھی، ایک دوسرے پر رشک بھی کرتے ہیں اور ترحم کی نظر بھی ڈالتے ہیں۔لیکن تمام متضاد عناصر مل کر ایک دوسرے کے کرداروں کو متشکل اور نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔سارہ کا کردار مصنفہ کی آپ بیتی پڑھتے ہوئے واقعات کی مکانی اور زمانی ترتیب سے با آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خود اپنی پوری داخلی کشمکش کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔اس کی زندگی میں ہر چیز مکمل ہے لیکن اس کا یہ احساس کہ ہر کاملیت کو زوال ہے اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔وہ بیوی اور ماں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خانہ بدوش جیسی زندگی بھی بسر کرنا چاہتی ہے اور ایک طالبہ کی طرح بے فکری سے گھنٹوں کالج کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر محوِ مطالعہ بھی رہنا چاہتی ہے۔مختصر یہ کہ وہ پابند اور آزاد دونوں سطحوں پر جینے کی آرزومند ہے۔اس ناول کے واقعات کی ترتیب میں اس کا حسن رضا سے شادی کرنا گویا پابند ہو کر محفوظ ہونے کی کوشش ہے جبکہ ہارورڈ

یونیورسٹی میں ایک طالبہ کی طرح بے فکری کا تجربہ اور لندن کا سفر، آزاد پنچھی کی طرح فضا میں اڑنے کی خواہش کا غماز ہے۔ مگر ۱۹۶۵ء میں بھارت جب پاکستان پر حملہ کرتا ہے تو وہ سب کچھ بھول کر صرف ایک ماں بن جاتی ہے اور ہر رنگینی ایک نکتے میں سمٹ کر مامتا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ گویا یہ ایک عورت کے وجود کے اندر کئی جہتوں کی موجودگی کی دلیل ہے۔

''کاروانِ وجود'' کا آغاز ہی وجود کیا ہے؟ کے سوال پر مبنی ہے۔ ثمر کا کردار وجودی عناصر اور سارہ کا کردار عینیت پسندی کے نظریے کو اجاگر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول میں ذات کی شناخت کا سوال ثمر اور سارہ دونوں کی صورتوں میں بڑے عمدہ مکالماتی انداز میں بار بار اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بسا اوقات قاری ان دونوں کرداروں کے متضاد فکری نظریات میں الجھ جاتا ہے کیونکہ دونوں کا نقطہ نظر اپنی اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ سارہ بھی وجود کی تلاش داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر کرتی ہے۔ مگر اس سفر کی کٹھنائیوں سے گھبرا کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتی ہے۔ وجود کی بے ثباتی کے خوف سے بچنے کے لیے وہ خود سے مضبوط سہارا حسن رضا کی شکل میں تلاش کرتی ہے اور یوں اس کے وجود کا بیڑا کچھ دیر کے لیے وقت کے ساحل پر لنگر انداز ہو جاتا ہے۔ لیکن وجود کے ہونے کا احساس خارجی سطح پر تو مکمل ہو جاتا ہے مگر داخلی سطح پر شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے۔ انجانے خوف کا سامنا ہے کیونکہ اسے کاملیت کے ساتھ ساتھ فنا کا یقین بھی خوف میں مبتلا رکھتا ہے۔ سارہ کی شکل میں مصنفہ کہانی میں وجود کی خارجی اور ثمر کی شکل میں وجود کی داخلی کیفیات کو ایک دوسرے سے نبرد آزما دکھاتی ہیں۔ اس طرح ناول میں کہے اور ان کہے مکالموں سے یہ بحث جاری رہتی ہے اور کہانی کی فضا متحرک رہتی ہے۔ ''سارہ'' کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے محمد علی صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''سارہ مشرقی خمیر میں گندھی ہوئی تھی۔ لیکن اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے مغربی ادب اور علوم بنی نوع انسان کی ترقی کے لیے آزمودہ منازل ثابت ہو چکے ہیں۔ وہ بنی نوع انسان کی صفاتی ترقی کی خواہاں ہے۔ وہ صنف نازک کے بارے میں ''مرد ذات'' کے خیالات میں بنیادی تبدیلی چاہتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ عورتوں کی آزادی کے بارے میں قبائلی نظام کی بہبود کے لیے کوئی اخلاقی یا مذہبی جواز تلاش کیا جا سکے''(۳)

ثمر کا کردار اپنے اندر سحر انگیزی اور پراسراریت سموئے ہوئے ہے۔ ناول کی ابتدا سے اختتام تک اسی کی

دلکشی، سحر برقرار رہتی ہے۔ ثمر کے کردار میں انتخاب و عمل کی آزادی کا عنصر وجودیت کا مظہر ہے۔ وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارتی ہے۔ وہ میشل سے محبت کے باوجود اس کا معروض بننا پسند نہیں کرتی، اسی طرح جب حسن رضا سے شادی کرتی ہے تو بھی تنسیخِ نکاح کا حق اپنے پاس رکھتی ہے۔ جمال پرستی مادیت کی حامی جبکہ وجودیت لذتیت سے منکر ہوتی ہے، ثمر کا کردار بھی اس انکار کی عکاسی کرتا ہے۔ ثمر کے نزدیک زندگی کی ہر راہ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں اور ہر چیز یہاں تک کہ کوئی خوشی بھی ملتی ہے تو بھی اس کی کوئی نہ کوئی قیمت چکانی پڑتی ہے یہی وجودی فکر کی اساس ہے۔

> ''چٹ بھی قیمت، پٹ بھی قیمت اور یک مشت نہیں ایک ساتھ نہیں لحظہ لحظہ ہر آن، قسط در قسط، قیمت، قیمت، بچپن کا حساب دو، جوانی زناٹے سے گزرتی دیکھو، بڑھاپے کا سامان کرو، پھر بڑھاپے کا کشٹ اُٹھاؤ۔ اس کٹھن راہ کے اختتام پر جانکنی کا عذاب اور ابدی دوزخ کا ہوّا۔ اتنی بڑی قیمت چند سانسوں، چند رنگوں، چند ذائقوں کے لیے؟؟(۴)

ثمر اپنے داخل میں اس قدر گم ہے کہ اس کو گرد و پیش سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اُڑتے ہوئے پرندے، بادل اور فطرت میں خود کو دیکھتی ہے اور مسحور ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ گلہری کی جون میں خود کو دیکھ کر سرشاری اور آزادی کی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہے۔ اسلوب احمد انصاری ''کاروان وجود'' کے مرکزی کردار ثمر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثمر کا زمین و زمان سے واسطہ کچھ کم ہی ہے۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں محصور رہتی ہے اور مرئی اشیا بھی اس کے لیے بے حقیقت رہتی ہیں۔ جب تک کہ وہ انھیں چھو کر ان کے مرئی ہونے کا یقین نہ کر لے۔ وہ ایک ناسوتی نہیں لا ہوتی مخلوق نظر آتی ہے یا موجودہ محاورے میں اس کی اپنی وجودی کائنات معتبر ہونے کے باوجود نامعتبر اور محض اضافی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو زمین اور آسمان کی وسعتوں کے درمیان معلق گردانتی ہے۔

اگرچہ ثمر کا کردار کاملیت کا عمدہ نمونہ ہے لیکن یہ مضبوطی کہیں کہیں متزلزل ہوتی بھی دکھائی دیتی ہے جہاں ثمر اپنے وجود کو وقت کے سامنے فنا کا تصور کرتے ہوئے سراپا سوال بن جاتی ہے:

> ''یہ لمحہ یہ عکس اسی موجود ثانیے میں، اس کے ساتھ ساتھ وقت میں ڈوب کر فنا ہو جائے گا۔ کیسے وہ وقت کو روکے؟
> کیسے وہ حسن، شادابی، تازگی کو فنا ہونے سے بچائے؟(۵)
> ''۔۔۔اسے لگا کہ ابتدائے عالم ہے اور انسان عدم وجود سے وجود کی طرف روانہ ہے اور ایک انسان دوسرے کو چھو کر وجود کو غیر وجود سے ممیّز کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔(۶)

ثمر اپنے وجود کی شناخت کے لیے ایک دوسرے وجود کی محتاج دکھائی دیتی ہے۔جس کو چھو کر محسوس کر کے اپنے ہونے کا احساس کر سکے۔وہ وجود کوئی جسم بھی ہوسکتا ہے اور کوئی شے بھی۔کیونکہ اس کا اپنا وجود اس کے خیال میں موہوم ہے۔عدم شناخت کا یہ بحران بھی دراصل وجودیت کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

> ''۔۔۔۔تو وہ ثمر کیا ہوگی ؟ ایک ہیولیٰ،ایک روح،ایک سایہ،جو کتاب ہاتھ سے رکھتے ہی بے وجود ہو جایا کرے گی۔وہ اپنے کم توفیق آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔اس کے چہرے پر ہلکا اندھیرا تھا اور آئینے میں اس کا عکس غیر واضح اور مبہم نظر آ رہا تھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔وہ کیسے کسی کو بتائے کہ وہ ایک روحِ محض ہے اور اپنے جسم سے اس کا ناطہ نہیں جڑا۔چنانچہ اس کا کوئی مخصوص جسم کوئی مخصوص وجود نہیں ہے۔اور یہ کہ وہ اس گھر کے باسیوں کی زندگیوں کے کنارے سے چپکی اپنے لیے کوئی ہیئت،کوئی خاکہ حاصل کر رہی ہے۔جب وہ خوش ہوتی تو یہ بے وجودی ایک عظیم آزادی،ایک وجد اور سرشاری میں تبدیل ہو جاتی۔جیسے وہ کوئی بحر ہو۔۔۔''(۷)

ثمر،میثل سے محبت کرنا چاہتی ہے لیکن وجود کے کامل نہ ہونے کا احساس اسے اپنے گھیرے میں لیے رکھتا ہے۔اپنے اس ادھورے وجود کے ساتھ وہ اپنے ہونے کا احساس میثل کو نہیں کروا سکتی۔سارہ کے سوال کے جواب میں کہتی ہے۔

> ''عشق صرف وہ نیک بخت کر سکتے ہیں جن کا کوئی ٹھوس،واضح وجود ہو۔میں نے تو اپنی بے وجودی کے علاج کے طور پر عشق میں پناہ ڈھونڈھی تھی۔لیکن مجھ میں جو خلاء حائل ہے،اس میں کہیں مجھ سے میرا محبوب بھی چھوٹ جاتا ہے۔''(۸)

کہانی میں مرد کردار حسن رضا،میثل اور سراج نسوانی کرداروں کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔کاروان وجود ناول کی عام روایت سے ہٹا ہوا ناول ہے۔اس میں کہانی کے خارج سے زیادہ باطن اور اس کے اندر اٹھتے سوالات کے طوفان کو موضوع بنایا گیا ہے۔کہانی میں محبت کی بجائے ''ذات'' مرکزی موضوع ہے۔اس ناول پر فرانسیسی ادب کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔اس ناول میں کسی تحریک یا رجحان کے پرچار کا رویہ تو دکھائی نہیں دیتا مگر وجودیت ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جو مصنفہ نے کاروانِ وجود میں پیش کیے ہیں۔

''کاروان وجود'' کی ایک اور اہم خاصیت مصنفہ کا اپنے نظریات میں واضح مؤقف ہے لیکن وہ اپنے

نظریات کی لاٹھی سے کرداروں کو ہانکنے کی بجائے واقعات کے منطقی ربط سے متوقع نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔اس ناول میں زندگی کے تمام حقائق فرد سے لے کر قوم تک کا احاطہ بڑے تجزیاتی انداز میں کیا گیا ہے۔یہاں تک کہ مصنفہ قوموں کے تہذیبی رویوں اوران میں نظریاتی تصادم کو بھی کہانی میں بہت عمدگی سے پیش کرتی ہیں۔فرد کی باطنی کشمکش کو کرداروں کے ذریعے بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔جبکہ قوم کے مسائل جو بلاشبہ فرد کی ذات پر خارجی اور باطنی دونوں حوالوں سے اثر انداز ہوتے ہیں کو پس منظر اور پیش منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔مصنفہ مختلف کرداروں کے ذریعے سیاسی بحثیں چھیڑتی ہیں لیکن خود کسی ایک نظریے کی تائید یا تردید نہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہیں۔جس سے قاری کے ذہن میں قومی اور سیاسی رویوں پر خود بخود سوال جنم لیتے ہیں۔کہانی میں قیام پاکستان اوراس کے بعد ابھرنے والے تہذیبی بحران اور ذہنی انتشار کو ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔پاکستانی سیاست کو بھی کہیں کہیں مکالموں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔جمہوریت کی کمزوریوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مارشل لاز کو بھی بڑے تجزیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مصنفہ پولنگ اسٹیشن پر ہونے والی دھاندلی کی منظر کشی کرتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھ جاتی ہیں جبکہ قاری محوِ حیرت ہو کر متوقع معاشرتی بگاڑ کی پیدا ہونے والی صورتِ حال کو بخوبی بھانپ لیتا۔

''کاروان وجود'' میں تہذیبی تشخص کے بحران اور رنگ ونسل کے نام پر تعصّبات کو بھی ناول کا موضوع بنایا گیا۔اس بحث کو بظاہر ہاورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ہنری کسنجر کی زبانی پیش کیا گیا ہے لیکن ذرا باریکی سے دیکھا جائے تو ناول میں مغرب اور مشرق دو کرداروں کی شکل میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔نثار عزیز بٹ ناول کے اس حصے میں اپنی ذات کا دائرہ اتنا وسیع کر لیتی ہیں کہ نیگرو غلاموں،افریقی قبائلیوں اور نوآبادیاتی نظام کے تلے سسکتے اور یک رنگی کے عذاب میں مبتلا انسانوں کے درد کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے،ان کے حق کی آواز بن جاتی ہیں۔

پروفیسر ہارٹنر جب ایک نئے کلیے کے طور پر امریکن نیگرو کے غلام بنائے جانے کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''اب امریکن نیگرو ہی کو لیجیے۔اس کو بے شک غلام بنایا گیا لیکن صرف اس لیے کہ امریکیوں نے نیگرو کو کبھی انسان سمجھا ہی نہیں۔اگر وہ اس کو انسان سمجھتے تو کبھی غلام نہ بنا پاتے کہ ان کے دل میں انسان کی عظمت اور وقار کو پختہ یقین تھا۔بالکل بلارادہ سارہ نے پروفیسر ہارٹنر کو ٹوک دیا،''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جان بوجھ کر امریکیوں نے نیگرو کو

انسانیت کے دائرے سے خارج کر دیا ہوتا کہ اسے غلام بنایا جا سکے۔''(۹)

اسی سیمینار کے میں ہنری کسنجر اور سارہ کے درمیان مشرق کی روایت سے جڑت (ناسٹلجیا) اور ترقی کی خواہش (ماڈرنائزیشن) کی کشاکش پر بحث بھی دو تہذیبوں کے فکری تفاوت کی عکاسی کرتی ہے۔ سارہ کے مطابق ایشیائی نااہل یا پسماندہ نہیں ہیں بلکہ پراسرار لوگ ہیں اور ترقی تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن ہر تہذیب کے اپنے اپنے بنیادی رویے ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کے تصورات ہوتے ہیں۔

جب نئے ملکوں کے تشخص پر سوال اٹھایا گیا تو سارہ کی دلیل بہت جاندار دکھائی دیتی ہے کہ کیا ایشیا میں یورپ کے ورود سے پہلے وہاں بڑی جاندار تہذیبیں موجود تھیں۔ کیا واضح تشخص کے بغیر کوئی قوم اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے۔ جس کے جواب میں پروفیسر ہنری کسنجر کہتے ہیں کہ جتنا تشخص ایک افریقی قبیلے میں ہوتا ہے وہ کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ جبکہ سارہ ایک قبائلی تشخص کی نہیں بلکہ ایک وسیع تر تہذیبی تشخص کی بات کر رہی ہے۔

نثار عزیز بٹ اپنے کرداروں کو تخلیق کر کے ان کے کاندھوں پر اپنے خیالات کا بوجھ نہیں ڈالتیں بلکہ تمام کردار مل کر ایک مجموعی تاثر پیدا کرتے ہیں جس سے کہانی میں لطافت اور تخلیقی آہنگ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں فرد سے جڑی تہذیب اور شناخت کے بحران کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ جس میں بظاہر ایک فرد اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے جبکہ وہ نسلی تعصب اور فرقہ واریت کا شکار ہو کر ذہنی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے فرد اور تہذیب دونوں کی شناخت کا سوال اٹھایا ہے۔

> ''منشا یاد نثار عزیز بٹ کے ناولوں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مصنفہ نے اپنے ناولوں میں ۱۹۲۲ء سے دور حاضر تک کے مسلم معاشرہ کی سیاسی و سماجی اور تہذیبی تاریخ قلمبند کر دی ہے''(۱۰)

''کاروانِ وجود'' میں بھی عدم شناخت کا مسئلہ، موت اور فنا کے سامنے زندگی اور بقاء کی کشمکش، لاحاصلی کا کرب، یہ تمام عناصر اس کے مرکزی کرداروں کا المیہ بن کر ابھرتے ہیں، جو دراصل دورِ جدید کے ہر فرد کا مسئلہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شہزاد منظر، تخلیقی ادب، ۲، کراچی، مشمولہ نوائے وقت، راول پنڈی، ۱۲ مئی ۱۹۸۱ء، ص ۴

۲۔ میرزا ادیب، مشرق، ۲۳ فروری ۱۹۸۱ء

۳۔ محمد علی صدیقی، ''کاروان وجود ایک مطالعہ''، ماہنامہ افکار، اپریل ۱۹۸۲ء، کراچی، ص ۱۸

۴۔ نثار عزیز بٹ، ''کاروان وجود''، ایس ٹی ہرمزار، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء، ص نمبر ۴ ۱۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۸۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۹۔ ایضاً، ۲۲۴

۱۰۔ منشا یاد، نوائے وقت راول پنڈی، ۱۲ مئی ۱۹۸۱ء